حرفِ آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انکارِ خدا کے نتائج

سید جلال الدین عمری

قدیم زمانہ میں انسان نے خدا کے انکار کی تو ہمت نہیں کی البتہ اس کی صفات کو سمجھنے میں غلطی کی۔ کبھی خدا کی خدائی کو بانٹ دیا اور ایک خدا کے بہت سے خدا بنا ڈالے، کبھی خدا کی مخلوقات کو خدا کا مقام دے دیا اور کبھی خدا کو اس کی مخلوقات کی طرح بے بس و مجبور سمجھ بیٹھا، کبھی خدا کو اپنی ذات پر قیاس کیا اور وہ ساری کم زوریاں اس کی طرف منسوب کر دیں جو خود اس کے اندر پائی جاتی ہیں، کبھی اس کی رحمت سے مایوس رہا اور کبھی اس کے غضب سے بے خوف ہو گیا، خدا کے بارے میں اس طرح کے غلط تصورات کی وجہ سے خدا سے اس کا صحیح تعلق قائم نہ ہو سکا اور وہ خدا کو ماننے کے باوجود اس سے دور ہی رہا۔

خدا کے بارے میں یہ تصورات اس قدر غیر علمی اور نامعقول ہیں کہ وہ کائنات کے علمی اور سائنٹفک مطالعہ کا ہرگز ساتھ نہیں دے سکتے۔ موجودہ دور میں اس کا زبردست ردِّ عمل ہوا۔ اس نے ان غلط تصورات کی اصلاح نہیں کی بلکہ خدا ہی کا انکار کر دیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے انکارِ خدا کی کوئی تجویز پاس کی اور اس کا متفقہ اعلان کیا بلکہ اس نے اس کائنات کی جو توجیہ کی وہ خدا کے تصور سے خالی ہے۔ اس نے کہا اس کائنات کا نہ کوئی خالق ہے نہ مالک، یہ محض مادہ کا ظہور ہے۔ مادہ ہی اس کا خالق ہے، مادہ ہی نے اتفاق سے ایک نامعلوم عرصہ میں مختلف سیاروں اور ستاروں کی شکل اختیار کر لی۔ اسی میں ہمارا نظامِ شمسی بھی داخل ہے۔ یہاں پائی جانے والی ساری جان دار اور بے جان چیزیں اور خود انسان کا وجود بھی اسی اتفاق کا کرشمہ ہے۔ اس زمین و آسمان میں نہ کہیں خدا کا

وجود ہے اور نہ اسے ماننے کی فی الواقع کوئی ضرورت ہے کائنات کی یہ توجیہ آج کے دور کی علمی اور سائنٹفک توجیہ مان لی گئی۔

یہ بالکل نامعقول بات ہے کہ اندھے بہرے مادہ کے عمل کو اور بھی اتفاقی عمل کو، اس وسیع و عریض اور مربوط و منظم کائنات کا خالق تسلیم کرلیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کو ایک خدا نے پیدا کیا ہے اور وہی اسے چلا رہا ہے۔ لیکن موجودہ دور اسے غیر مادی توجیہ سمجھتا ہے اور وہ اس 'مادی کائنات' کی کوئی 'غیر مادی توجیہ' قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ایک حقیقت کا انکار کیا گیا

آدمی جب کسی حقیقت کا انکار کر کے کوئی اقدام کرتا ہے تو اسے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ حقیقت جتنی بڑی ہوگی اتنا ہی بڑا نقصان بھی ہوگا، اگر راستہ میں کوئی پتھر پڑا ہو اور آپ اسے تسلیم کیے بغیر آگے بڑھیں تو چوٹ کھا سکتے ہیں۔ لیکن اگر کسی مصروف سڑک پر یہ سمجھ کر آپ سرپٹ دوڑنے لگیں کہ یہاں کوئی ٹریفک نہیں ہے تو آپ کی ہلاکت یقینی ہے۔ خدا کا وجود اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اسے مانے بغیر انسان اس کائنات سے صحیح تعلق قائم نہیں کرسکتا۔ وہ جو بھی قدم اٹھائے گا سراسر تباہی کی طرف جائے گا۔ چنانچہ موجودہ دور کو خدا کے انکار کے بعد بڑے گھناؤنے نتائج سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ان میں سے صرف بعض نتائج کی طرف یہاں ہم اشارہ کریں گے۔

انسان کو حیوان بنا دیا گیا

اگر بے جان مادہ سے یہ کائنات پیدا ہوئی تو یہاں زندگی کہاں سے آئی اور حیوانات اور سب سے بڑھ کر انسان کا وجود کیسے ہوا؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں زندگی کا آغاز واحد الخلیہ حیوانات سے ہوا۔ ان میں خود بخود زندگی کے بالکل ابتدائی آثار نمایاں ہوئے، پھر ان کی نسلوں میں آہستہ آہستہ جسمانی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یہ تبدیلیاں جب ایک خاص حد کو پہنچ جائیں تو نئی نئی انواع حیوانات وجود میں آجاتیں۔ ان میں سے جو انواع خود کو ماحول سے ہم آہنگ کرسکیں

ان کا سلسلہ جاری رہا اور باقی ختم ہوتی چلی گئیں۔ اسی عمل سے انسان کا بھی وجود ہوا۔ وہ سلسلہ حیوانات ہی کی ایک کڑی ہے جو مختلف مراحل طے کرتے ہوئے ایک خاص شکل اختیار کر گئی ہے۔

یہ نظریہ ارتقاء ہے جسے انیسویں صدی کے وسط میں ڈارون نے پیش کیا۔ اسے بعض دوسرے ہم خیال سائنس دانوں نے آگے بڑھایا، اس کے مختلف گوشے واضح کیے، اس کی تفصیلات مرتب کیں، بعض لوگوں نے اس سے جزوی اختلاف کیا لیکن اصولی طور پر اس سے متفق رہے۔ بعض نے اس پر سخت تنقید کی اور اس کی کمزوریاں واضح کیں۔ یہ تنقید علمی اور فلسفیانہ بھی تھی اور خالص سائنسی اور حیاتیاتی نقطۂ نظر سے بھی تھی۔ چنانچہ اس کی حیثیت اب تک محض ایک نظریہ کی ہے کسی ثابت شدہ حقیقت کی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود مغرب نے اسے خیالات و افکار اور سیاسی نظام کے سارے اختلافات کے باوجود آگے بڑھ کر اس طرح قبول کیا جیسے اس میں کوئی نقص نہیں ہے یا کم از کم علمی سطح پر اس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ تعلیم گاہوں میں اسی کا درس دیا جانے لگا، سائنسی تجربات اور اثری اکتشافات سے یہی ثابت کیا گیا اور مختلف طریقوں سے یہ بات ذہن نشین کرائی گئی کہ انسان کوئی برتر مخلوق نہیں ہے بلکہ محض حیوان کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ انسان کو حیوان ثابت کرنے کی یہ پہلی اور منظم کوشش تھی۔

انسان حیوان کی حیثیت سے سوچنے لگا

اس کا سب سے بڑا اثر یہ مرتب ہوا کہ انسان اپنے بارے میں ایک حیوان کی حیثیت سے سوچنے لگا۔ حیوان صرف طبعی تقاضے رکھتا ہے اور ہر ممکن طریقہ سے ان کی تکمیل کی کوشش کرتا ہے اس کے سامنے صرف وقتی لذت ہوتی ہے اور فوری خطرات کے سوا کوئی دوسرا خطرہ اسے نہیں ہوتا اس کے پیش نظر کچھ غیر مادی یا روحانی مقاصد نہیں ہوتے۔ اس کا کوئی ایسا اخلاقی نصب العین نہیں ہوتا جس کے لیے وہ مادی ضرورتوں اور آسائشوں کو قربان کر سکے۔ وہ اپنے اعمال میں غلط اور صحیح کی تمیز اور کسی برتر ہستی کے سامنے جوابدہی

کے احساس سے خالی ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح حیوانی ضروریات ہی انسان کی اصل ضروریات اور حیوانی تقاضے ہی انسان کے اصل تقاضے قرار پائے اس کے لیے کسی ایسے تقاضے کو ماننا مشکل ہوگیا جو حیوان میں نہ پایا جاتا ہو۔ اس نے اخلاقی پابندیوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے اعمال میں خدا کے سامنے جواب دہی کے احساس سے اس کا ذہن خالی ہوگیا۔ اس نے سوچا اس سے ان باتوں کا مطالبہ غلط ہے جن کا مطالبہ کسی حیوان سے کبھی نہیں کیا جاتا۔ جب وہ حیوان ہے تو اس کی فطرت حیوانی ہوگی اور اس سے حیوانی خصوصیات ہی کا ظہور رہوگا۔ ذہن وفکر کا یہ انقلاب بڑا برا انقلاب تھا اور انسان ایک ہی جست میں پستی کی آخری حد کو پہنچ گیا۔

معاشی تقاضے اصل قرار پائے

حیوان کو زندہ رہنے کے لیے غذا کی اور اپنی نسل کو باقی رکھنے کے لیے جنسی خواہش کی تکمیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دو ضرورتوں کے پورا ہونے کے بعد وہ آسودہ ہوجاتا ہے اور اسے کسی دوسری چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ انسان کے لیے بھی ان ہی دو ضرورتوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی بلکہ یہی اس کی حقیقی اور بنیادی ضرورتیں قرار پائیں۔ اس کے لیے نئے نئے فلسفے وجود میں آئے اور اس کی حکمت اور معقولیت سمجھائی جانے لگی۔

اس میں شک نہیں غذا کی بڑی اہمیت ہے اور انسان صرف غذا ہی کا نہیں لباس مکان اور دیگر معاشی ضروریات کا بھی محتاج ہے۔ ان سے وہ بے نیاز نہیں ہوسکتا لیکن دورِ جدید نے اسی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ کارل مارکس کے نزدیک معاش ہی انسان کا اصل مسئلہ ہے۔ اسی کی بنیاد پر فلسفہ، اخلاق، تہذیب وتمدن اور مذہب وجود میں آتے ہیں۔ اسی کے گرد انسانی تعلقات گھومتے ہیں اور سیاسی نظام قائم ہوتا ہے۔ اس نے کہا معاش ہی سیاسی انقلابات کا سبب بنتی ہے۔ جب وسائلِ حیات پر کچھ لوگوں کا قبضہ ہوجاتا ہے اور کچھ لوگ اس سے محروم ہوجاتے ہیں تو ان کے درمیان کشمکش شروع ہوجاتی

ہے۔ اور بالآخر جو محروم ہوتے ہیں برسرِ اقتدار طبقہ سے وسائل حیات چھین لیتے ہیں اور خود اقتدار کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔ ایک عرصہ کے بعد پھر سوسائٹی دو طبقوں میں بٹ جاتی ہے اور ایک نئی کشمکش شروع ہو جاتی ہے جس کے نتیجہ میں لازمی طور پر ایک اور انقلاب برپا ہوتا ہے اور وسائل حیات دوبارہ محروم طبقہ کے ہاتھ میں چلے جاتے ہیں۔ پوری تاریخ اس کے نزدیک ان ہی معاشی انقلابات کا نام ہے۔ اس وجہ سے اس نے ساری خرابیوں کی جڑ انفرادی ملکیت کو قرار دیا اور اس کا حل یہ بتایا کہ وسائل حیات افراد سے چھین کر قومی ملکیت میں دے دیے جائیں۔ اسی تصور کے تحت کمیونسٹ ممالک میں انقلاب آیا۔ مارکس کا پورا فلسفہ ہی معاش کے گرد گھومتا ہے اس لیے اس کے زیر اثر جن ممالک میں انقلاب آیا اگر ان کا مطمحِ نظر صرف روٹی، کپڑا اور مکان ہو تو تعجب ہرگز نہیں ہے اس لیے کہ اس سے آگے وہ سوچ ہی نہیں سکتے۔ لیکن جن ممالک نے اس فلسفہ کو تسلیم نہیں کیا وہ بھی صرف اسی کے لیے جی رہے ہیں۔ کوئی اور مقصد حیات ان کے سامنے بھی نہیں ہے۔ انفرادی ملکیت اور اجتماعی ملکیت کی بحث کے باوجود دونوں کی منزل ایک ہے۔ دونوں بنیادی ضروریات سے اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں اور تعیشات کی طلب میں گم ہو جاتے ہیں۔

جنسی بھوک بڑھا دی گئی

حیوانی زندگی کا دوسرا اہم تقاضا جنسی تسکین ہے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے، اس کی تسکین ہونی چاہیئے قدرت نے بعض مصالح کے تحت اس میں بڑی لذت رکھی ہے۔ اس میں بے اعتدالی فرد اور جماعت دونوں کے لیے تباہ کن ہے۔ لیکن موجودہ دور اپنے اعصاب پر جنسی جذبہ کو اس طرح مسلط کر چکا ہے کہ اس کے بہترین جذبات اس کے مقابلہ میں دب گئے ہیں وہ حدِ ضرورت کے اندر اس کی تکمیل کو کافی نہیں سمجھتا ہے اور اس کے عواقب و نتائج سے بے پرواہ ہو کر دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا ہے فرائڈ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ پیدائش سے لے کر موت تک انسان کے ذہن و دماغ پر یہی تصور چھایا رہتا ہے۔ اسی کی حکومت خواب اور بیداری ہر حالت میں ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ جذبہ شعور کی سطح پر نظر نہیں آتا لیکن

تحت الشعور میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ فرائڈ کے نزدیک ان تعلقات میں بھی جن میں جنس کے تصور کو انسان گناہ سمجھتا ہے اسی جذبہ کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ماں اور بچہ اور بھائی اور بہن کے تعلقات بھی اس سے پاک نہیں ہوتے۔ اس تصور کو مغرب نے اس طرح اپنایا کہ اس کی تہذیب اور معاشرت اس کے گرد گھومنے لگی، آرٹ اور کلچر اس کے ترجمان بن گئے، رقص و موسیقی، کھیل کود، تصویر کشی اور مورت سازی ہر چیز سے اس کا اظہار ہونے لگا۔ جنسی جذبات کو بھڑکانے کا ہر طرف سامان فراہم کیا گیا اور ان جذبات کی تسکین کے لیے نت نئی تدبیریں کی جانے لگیں۔ جو کام پردے کے پیچھے اور بند کمروں میں ہوتا تھا وہ بازاروں، سڑکوں، پارکوں اور تفریح گاہوں میں انجام پانے لگا۔ اس وقت انسان جنسی خواہش پر کسی قسم کی بندش گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ جتنی بڑھ سکتی ہے بڑھے اور اس کی تکمیل کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

دولت کی پرستش ہونے لگی

مادی ضروریات کی کوئی حد نہیں ہے۔ ان کو کم نہ کیا جائے تو وہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔ اس وقت انسان انھیں کسی قیمت پر کم کرنا بھی نہیں چاہ رہا ہے۔ وہ سوچ سوچ کر اور بہ تکلف نئی نئی ضرورتیں پیدا کر رہا ہے اور ان کو پورا کرنے کے لیے سرگرداں بھی ہے۔ اس کے لیے وہ شب و روز دولت کے حصول کی فکر میں ہے۔ اس کی ساری توانائی اسی پر صرف ہو رہی ہے۔ وہ دولت کمانے کی ایک مشین بن کر رہ گیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرے اور بڑھی ہوئی ضروریات پوری کرتا رہے۔ آج کے دور کو مسابقت کا دور کہا جاتا ہے۔ یہ مسابقت صرف دولت کے لیے ہے۔ کسی اور میدان میں نہیں ہے۔ ہر شخص دولت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ آج دنیا کی ساری ہماہمی اور رونق اسی کے لیے نظر آتی ہے۔ دولت سے اونچی کسی قدر کا تصور بھی اس کے لیے دشوار ہو رہا ہے۔ دولت کی پرستش پہلے بھی ہوتی تھی لیکن آج دنیا نے جس یکسوئی، خلوص اور محبت کے ساتھ اس کے سامنے اپنی جبین نیاز ٹیک دی ہے اس کی مثال شاید کہیں اور کسی دور میں نہیں مل سکے گی۔

انسان سکون سے محروم ہوا

اس کے نتیجہ میں بلاشبہ دولت و ثروت کی فراوانی ہے۔ مادّی ضروریات بہتر طریقہ سے پوری ہو رہی ہیں۔ وہ اسبابِ حیات جو آج سے پہلے معدودے چند افراد کو نصیب تھے انسانوں کی بڑی تعداد کو حاصل ہیں۔ عام انسان کے دست رس اور استعمال میں وہ چیزیں بھی آنے لگی ہیں جنھیں وہ رشک و حسرت سے صرف دیکھا کرتا تھا۔ اس سے بظاہر اس کی پریشانیاں دور ہو جانی چاہیئے تھیں، اسے سکون اور چین ملنا چاہیے تھا اور اسے پورے اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے تھی۔ لیکن وہ پہلے سے زیادہ سکون اور اطمینان سے محروم ہے۔ وہ اس بھری دنیا میں خالی ہاتھ محسوس کر رہا ہے۔ وہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے کبھی منشیات کا سہارا لیتا ہے، کبھی ہپی بن جاتا ہے، کبھی خودکشی کر بیٹھتا ہے۔ اور کبھی حالات کے رحم و کرم پر اپنے آپ کو چھوڑ دیتا ہے اور سخت سے سخت نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

اخلاق کا زوال ہوا

زندگی کے حیوانی تصوّر نے اخلاقی قدروں کو سخت نقصان پہونچایا ہے۔ انسان کے اندر جنسی خواہش، شکم پروری، خود غرضی، مفاد پرستی، حرص و لالچ، جھوٹ، مکر و فریب، خیانت، حملہ اور انتقام جیسی حیوانی خصوصیات ابھر آئیں اور وہ ایثار و محبت، ہمدردی و غم خواری، صداقت و دیانت، عفو و درگزر اور عفت و عصمت جیسی اعلیٰ اخلاقی صفات سے محروم ہو گیا۔ آج پوری دنیا اس کے نتائج سے گھبرا رہی ہے۔ لیکن جب تک انسان کے بارے میں اس سے بہتر تصور نہ ہو بہتر اور برتر اخلاقیات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ اس حیوانی تصور کے لازمی ثمرات ہیں جو مغرب نے دل و دماغ میں بٹھا دیا ہے۔

اسلام کا تصورِ حیات

اس مادہ پرستی اور اخلاقی گراوٹ سے اسلام نجات دلاتا ہے۔ اس کے نزدیک

یہ کائنات بے خدا کے نہیں ہے۔ اس کا بلا شرکت غیرے ایک خالق و مالک اور حاکم مطلق ہے۔ انسان اس کا بندہ اور مخلوق ہے۔ وہ کیڑوں مکوڑوں اور جانوروں کی طرح کوئی حقیر مخلوق نہیں ہے بلکہ ایک برتر اور اعلیٰ مخلوق ہے۔ وہ یہاں آزاد اور خود مختار نہیں ہے بلکہ اسے اپنے خالق و مالک کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنی ہے۔ اس نے اپنے رسولوں کے ذریعہ اپنی مرضی سے آگاہ کردیا ہے اور یہ بتادیا ہے کہ اس کے لیے صحیح طریقہ حیات کیا ہے اور غلط طریقہ حیات کیا؟ یہ طریقہ نہ تو رہبانیت کا ہے اور نہ بے قید حیوانی زندگی کا۔ اس نے انسان کے لیے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود متعین کردیے ہیں۔ ان حدود کے اندر وہ اپنی ضروریات اور خواہشات پوری کرسکتا ہے۔ ان ضروریات کے پورا کرنے میں اگر وہ ان حدود سے تجاوز کرے تو اس کی سزا اسے اس دنیا میں بھی اٹھانی پڑے گی اور اس کے بعد آنے والی زندگی میں بھی اسے خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا۔

اس کائنات کی صحیح حیثیت متعین کرنے اور اس سے صحیح تعلق قائم کرنے کے لیے ایک ایسے نظریہ کی ضرورت ہے جو اس پر پوری طرح فٹ ہو جائے اور اس کے بارے میں اٹھنے والے ہر سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دے۔ اسلام کا یہ نظریہ کائنات بہت ہی صاف، معقول اور مدلل ہے اور کائنات کی صحیح ترین توجیہ پیش کرتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت سے اس قدر ہم آہنگ ہے کہ اس کو قبول کرکے انسان اس ذہنی انتشار اور پراگندگی سے محفوظ رہ سکتا ہے جس میں آج وہ گرفتار ہے۔

پھر یہ کہ خدا کا وجود انسان کی ایک حقیقی ضرورت ہے، اس کی نفسیات اس کے بغیر کبھی مطمئن نہیں ہوسکتی۔ اس کائنات میں اسے ایک ایسی ہستی چاہیے جسے وہ سب سے برتر اور بلند تر سمجھے جس میں وہ کسی کمزوری اور خامی کا تصور نہ کرسکے، جس کے بارے میں اسے یقین ہو کہ وہ اس کی ہر پکار سنتا ہے اور اس کی پریشانیوں کو دور کرسکتا ہے۔ اپنے نازک ترین مسائل کو بھی جس کے حوالہ کرکے وہ مطمئن ہوسکے کہ اس نے اس کائنات کی سب سے بڑی طاقت کے حوالہ انھیں کردیا ہے اور وہ چاہے تو آن کی آن میں انھیں حل کرسکتا ہے۔ اور ہر چھوٹی بڑی راحت اور خوشی کو جس کا الطاف و انعام وہ تصور کرے، جس کے بارے میں اسے یقین ہو کہ وہ علم و حکمت

کا خزانہ ہے اور ساری قوتوں کا مالک ہے۔ اس کی قدرت اور طاقت کو کوئی چیلنج نہیں کرسکتا۔ جو اپنی بے نظیر خوبیوں اور کمالات کی وجہ سے اس کی عقیدت و محبت کا مرکز بن جائے اور جس کے سامنے سر جھکا کر وہ مطمئن ہو جائے کہ اس نے کائنات کی سب سے بڑی طاقت کے سامنے سر جھکا دیا ہے۔ یہ ذات خدا ہی کی ذات ہو سکتی ہے خدا کا انکار کر کے انسان اس سے محروم ہو جاتا ہے۔

زندگی کا حیوانی تصور انسان کو بے قید بنا دیتا ہے۔ وہ کسی چیز کے مفید یا غیر مفید ہونے کا فیصلہ اپنے ذاتی، قومی اور گروہی مفاد کی بنیاد پر کرتا ہے۔ بیشتر حالات میں ذاتی مفاد ہی اس پر غالب رہتا ہے۔ جس چیز سے اس کی ذات کو نفع پہونچے وہ اس کے لیے حلال اور مباح ہو جاتی ہے چاہے اس میں دوسرے کا نقصان ہی کیوں نہ ہو اور جو چیز اس کے لیے نقصان دہ ہے وہ اس کے لیے ناجائز قرار پاتی ہے چاہے وہ اس کی ابنائے نوع کے لیے کتنی ہی سودمند کیوں نہ ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو ماننے کے بعد انسان کچھ حدود و قیود کا پابند ہو جاتا ہے اور ان حدود ہی کے اندر اپنی ضروریات اور خواہشات پوری کرتا ہے۔ یہ حدود و قیود خود اس کی ذات کے لیے بھی مفید ہیں اور پوری سوسائٹی کے لیے بھی۔ ان حدود کو توڑتے ہوئے اسے یہ خوف رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بازپرس کرے گا اور اسے اس کا جواب دینا ہوگا سوال یہ ہے کہ کیا انسان اس پابند زندگی کو پسند کرتا ہے یا حیوانوں کی طرح بے قید زندگی گزارنا چاہتا ہے؟ اسی سوال کے جواب پر اس کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہے۔

کچھ ادارہ سے متعلق خدا کا شکر ہے کہ ادارہ کی اردو مطبوعات کا آغاز محترمی مولانا صدر الدین صاحب کی اہم تصنیف معرکۂ اسلام و جاہلیت سے ہوا ہے۔ اس کتاب میں مولانا محترم نے اسلام اور جاہلیت کی کشمکش اور اس کے اسباب و عوامل کا قرآن و حدیث کی روشنی میں بڑی دیدہ ریزی سے جائزہ لیا ہے مولانا کے قلم کی رعنائی اس کتاب میں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

ادارہ کی دوسری کتاب 'عہد نبوی کے غزوات و سرایا' پریس میں ہے توقع ہے ایک ماہ میں شائع ہو جائے گی۔
راقم کے کتابچہ 'اسلام اور اس کی دعوت' کا انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ محترمہ شہناز بیگم صاحبہ نے بہت ہی شستہ زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

بعض اور مسودات بھی موجود ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اشاعت کا ساز و سامان فرمائے آمین